ڈاکٹر نوید احمد گل
ایسوسی ایٹ پروفیسر (فارسی)
گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، شیخوپورہ

اقبال کی فارسی غزل میں تغزل کے رنگ

As there has always been a ot intellectual thought pertaining to the poetic prominence of Allama Iqbal, least attention has been paid to the aesthetic side of his verses. His distinctiveness has been acknowledged, while his parallelism overlooked; his thought is discussed in detail while his artistic perfection still needs due consideration. Even his ghazals are considered sources of knowledge, wisdom and intellect while the delicacies and beauties always remain condoned. This article aims to highlight the artistic gorgeousness of Iqbal's poetry.

جذبہ جب لفظوں میں ڈھل کر اپنا جلوہ دکھاتا ہے تو ادب(Literature) کہلاتا ہے۔یہ جلوہ گری سیدھی سادی ہو تو نثر اور ترنم آمیز ہو جائے تو شاعری کہلاتی ہے۔ سچائی باہر سے جھانکتی ہے تو سوچ اندر سے محسوس کرنا شروع کر دیتی ہے اس کیفیت کو کچھ وقت یونہی گزرتا ہے تو سوچ کو ایک خاص ڈھنگ نصیب ہو جاتا ہے اور ایسے ہی کچھ اور وقت گزرتا ہے تو سوچ، تڑپ بن جاتی ہے، تڑپ جب آہنگ سے جا ملتی ہے تو شعر بن جاتی ہے۔باذوق اصحاب تو آگاہ ہیں کہ "ذوقی اور وجدانی چیزوں کی جمع اور مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔"[۱] بلکہ ایسی باتوں کی صرف حدود متعین کی جا سکتی ہیں وہ بھی محال کے قریب قریب"، لہٰذا مسعود رضوی ادیب "اثرو موزونی کی یکسانی کو شعر قرار دیتے ہیں۔[۲]

جبکہ فارسی زبان کے ایک جدید محقق شفیعی کدکنی کا خیال یہ ہے کہ "سوچ، تخیل، زبان کو جب شاعرانہ آہنگ اور ہیئت مل جائے تو شعر بن جاتا ہے۔"[۳] لیکن اقبال شعر کے لیے ان پانچوں لوازم کا پُرسوز ہونا بھی از بس ضروری قرار دیتے ہیں۔[۴] اقبال نے اگرچہ خود کو کبھی شاعر، ادیب یا ناقد نہیں کہا مگر اُن کے کام نے ان کی یہ تینوں حیثیتیں منوائی ہیں اورخود کو "سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را"[۵] کہنے والے اقبال تو شعرِ محض اور شعرِ دلآویز میں بھی فرق کرتے ہیں:

صد نالۂ شبگیری، صد صبح بلا خیزی
صد آہِ شرر ریزی، یک شعرِ دلآویزی(۶)

مستزاد یہ کہ اقبال ان جملہ لوازم سمیت غزل (تغزل) کے لیے چشمِ محبوب کی ایک خاص کیفیت سے نیاز کی دریوزہ گری کو بھی شرط قرار دیتے ہیں:

باز بہ سرمہ تاب دہ، چشمِ کرشمہ زای را
ذوقِ جنون دو چند کن شوقِ غزلسرای را(۷)

مگر ہوا یوں کہ اقبال کے اکثر متوالے، جیالے بن گئے اور اقبال کے بارے عام آدمی تو عام محققین کی دنیا کا عام چلن یہی رہا ہے کہ اقبال کی مہانتا پر تو بہت کچھ لکھا گیا مگر اس کی "موہنتا" پر توجہ نہ دی گئی۔ اس کی انفرادیت کے تذکرے ہوئے مگر اس کی متوازیت کو نظر انداز کیا گیا۔ اس کے رفیع الشان فکر کی باتیں ہوئیں مگر ان کے جلیل القدر فن کو محض ابلاغِ فکر کی ایک مرقات قرار دے دیا گیا۔ اسی طرح اس کی غزل کو نظم ہی خیال کیا گیا، کنیزِ فکر بنا کر پیش کیا گیا حتیٰ کہ غزل میں موجود تغزل، اور اس کے رکھ رکھاؤ، روایتی لیے دیے رہنے کی کیفیتوں، اس کی شرمیلی باتوں اور لجائی گھاتوں کو دانستہ قلم انداز کیا گیا اور اگر کبھی نظر کی بھی تو سرسری سی، لکھا بھی تو عامیانہ سا اس مضمون میں اسی بے التفاتی کا ازالہ اور اسی کوتاہی کی تلافی کی کوشش کی گئی ہے۔

خاطرِ احباب میں یہ خیال بھی رہے کہ "غزل اور تغزل لازم و ملزوم ہیں۔ غزل جسم ہے اور تغزل اس کی روح۔ اگر غزل میں تغزل نہ ہو تو اس میں زندگی کے آثار کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ اس لیے غزل کے ساتھ تغزل کا خیال آتا ہے اور تغزل کے ساتھ غزل کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ غزل میں تغزل نہ ہو تو غزل باقی نہیں رہتی۔ غزل کے لیے تغزل ہی زندگی ہے کیونکہ تغزل ہی کے ہاتھوں اس میں "موجِ زندگی" رونما ہوتی ہے۔"(۸)

"تغزل" کی سب سے مقبول تعریف سید عبداللہ کی ہے: "تغزل درحقیقت بیان کی اس دل آسا، خیال انگیز اور دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جو جذباتِ درد و شوق سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ شیریں، سبک اور خیال انگیز لفظوں میں خاص طور پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ تغزل کی لَے ایک طرف اپنے خوشگوار نالوں سے خیال کو تمنا کی خواب آلود فضائوں سے آشنا کرتی ہے تو دوسری طرف درد انگیز نوکِ نشتر

سے روح میں دھیمی کسک اور چبھن بھی پیدا کرتی ہے۔تغزل خیال و بیان کی ایک مجموعی کیفیت کا نام ہے کسی صنفِ سخن کا نہیں۔“[۹]

فارسی اور اردو کی روایتی غزل میں تغزل اور نگار گری ساتھ ساتھ، پہلو بہ پہلو اور شانہ بشانہ چلتے ہیں۔اسی لیے پروفیسر وقار عظیم کہتے ہیں: ”غزل محبوب اور محبوبی کی باتیں ہیں اور تغزل وہ مجموعی کیفیت ہے جو محبوب کے ذکر اور محبوبی کی باتوں سے پیدا ہوتی ہے۔“[۱۰]”تغزل اس کیفیت کا نام ہے جو کسی غزل میں لطف و اثر اور حسن و درد سے پیدا ہوتی ہے۔“[۱۱] مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر، محبوب اور قاری کی سلیم طبعی اور سلیم اسلوبی سب کی باہم گُندھی اور گتھی ہوئی صورت کی ابلاغی کیفیت کو تغزل کہتے ہیں۔اقبال نے ایک جگہ خود بھی تغزل کی کیفیت کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور تغزل کا ہی سہارا لیا ہے پہلے استفہام اقراری کے انداز میں کہتے ہیں:

برہمنی بہ غزنوی گفت کرامتم نگر
توکہ صنم شکستہ ای بندہ شدی ایاز را[۱۲]

اقبال نے خود ہی اس کا جواب دیا ہے اور تغزل کی تعریف بھی سمجھا دی ہے جہاں پس منظر کے طور پر اقبال یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ ... محبوبیت ایک بہت بڑا منصب ہے بہت ساری ذمہ داریاں اس کے ساتھ بڑی خاموشی سے وابستہ ہیں۔اقبال اس کے لیے ”دردِ ایازی“ کی ایک ترکیب لائے ہیں اور پھر اس ترکیب کو ”فرائضِ منصبِ محبوبیت“ کے مترادف اور برابر قرار دیا ہے اور اسی ترکیب کو تغزل کی تعریف قرار دیا ہے۔اقبال کے مطابق محبوبِ تند خو اور بہانہ جُو پر بھی ایک ایسا وقت آجاتا ہے جب اس کے اندر محب ِادا شناس کی عادت پڑچکی ہوتی ہے:

کسی این معنیٔ نازک نداند جز ایاز اینجا
کہ مہر غزنوی افزون کند دردِ ایازی را[۱۳]

”غزل میں جس چیز کو غزل کی جان کہتے ہیں وہ تغزل ہے اور یہ غزل کی رمزی اور ایمائی کیفیت سے مشروط ہے۔“[۱۴] اور ڈاکٹر یوسف حسین اقبال کی غزل اور طبیعت میں موجود تغزل کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:” فارسی اور اردو غزل میں رمزنگاری کی جو مثالیں ملتی ہیں ان کی نظیر دنیا

کے کسی اور ادب میں موجود نہیں..."۔ ''اقبال کو نہ صرف تغزل بلکہ اپنے تغزل کے جمالیاتی محاسن کا بھی مکمل احساس تھا جو ان کی فارسی غزل میں جابہ جا ملتا ہے۔" [۱۵]

جبکہ پروفیسر وقار عظیم اس یافت اور دریافت سے آگے بڑھ کر بڑے فیصلہ کن انداز میں کہتے ہیں: "اقبال کے شعروں میں فکر، حکمت، اصلاح اور وعظ سب کچھ موجود ہے لیکن تغزل اس سارے ہجوم کو چیرتا، پھاڑتا بہ ہزار حسن و جلوہ سامنے آکر ساری فضا کو اپنے حسن کے کیف میں ڈبو دیتا ہے۔"[۱۶] اس مضمون میں اقبال کے یہاں موجود تغزل اور نگار گری کے چند دلدوز شوخ رنگوں کو دکھانے کے لیے فارسی ادب کے اکابرین فن سے اقبال کی ہمرنگی کا سہارا لیا گیا ہے جس میں دیگر شعراء کے علاوہ پاک و ہند کے حوالے سے خصوصی طور پر محمد حسین نظیری نیشاپوری (۹۲۳ھ) اور ایران کے حوالے سے، سب سے زیادہ خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی (۷۹۱ھ) سے استفادہ کیا گیا ہے۔ پیشکش کے لیے اس روشِ خاص کا التزام ڈاکٹر سید عبداللہ سے دریوزہ ہے۔[۱۷] یہاں نگار گری اور تغزل کے چند رنگ اور پرتو پیش کیے جاتے ہیں اور ان کے حوالے سے اقبال کے یہاں ان کی موجودگی اور زیبائی کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ مثلاً: تغزل میں محبوب کی اس سادگیٔ جاں ستاں کا ذکر ہوتا ہے جو ہزاروں ہوشیاریوں پر بھاری اور سیکڑوں پُرکاریوں پر حاوی ہوتی ہے اور پتھروں کو کلمہ پڑھوا دیتی ہے مثلاً: نظیر اکبر آبادی (۱۸۳۰ھ) محبوب کی ایسی ہی پُرکاری کا ذکر یوں کرتے ہیں:

دکھا کر اک جھلک دل کو نہایت کر گیا بے کل
پری رُو، تند خو، سرکش، ہٹیلا، چلبلا، چنچل[۱۸]

اقبال بھی محبوب کی ایسی ہی سادگی کی مداحی کرتا ہے جو نگارگری اور تغزل کی رعنائی لیے ہوئے ہے:

نگارِ من کہ بسی سادہ و کم آمیز است
ستیزہ کیش و ستم کوش و فتنہ انگیز است[۱۹]

محبوب کی ایسی ہی بے مثالیت کا ذکر نظیری بھی کرتے ہیں:

اگر حسن فروشان بہ جلوہ آمدہ اند
کسی بہ حسن و ملامت بہ یارِ مانہ رسد[۲۰]

لیکن اقبال کا رنگِ تغزل اور وصفِ نگار گری کچھ زیادہ پُرکار ہے۔اقبال نے نازوروں اورنازبروں میں ہونے والی اداؤں بھری پُرلطف آویزش کا تذکرہ بڑی فنی باریک نگہی سے کیا ہے:

زستیزِ آشنایان چہ نیاز و ناز خیزد
دلکی بہانہ سوزی نگہی بہانہ سازی(۲۱)

نگارگری، سراپا نگاری سے اور تغزل معاملہ بندی سے قدرے مختلف فکرو اسلوب ہیں۔تغزل میں اداؤں اور التجاؤں کا حسین امتزاج ہوتا ہے اس میں اقبال کے انداز و تغزل دیکھیے:

چند بہ روی خود کشی پردۂ صبح و شام را
چہرہ کشا تمام کن جلوۂ ناتمام را(۲۲)

جبکہ اقبال کا یہ شعر تو للچائی سراپا نگاری اور مبتدل معاملہ بندی سے دور کا بھی علاقہ نہیں رکھتا:

بر سرِ کفر و دین فشان رحمتِ عام خویش را
بندِ نقاب برکشا ماہِ تمامِ خویش را(۲۳)

خواجہ حافظ اقبال کے اسی رنگ کو کئی سو سال پہلے ادا کر چکے ہیں مگر دیکھیے اقبال نے محض نقل نہیں کی:

گرلاف زند ماہ کہ ماند بہ جمالت
بہ نمائی رخِ خویش مہ انگشت نما کن(۲۴)

اقبال اور حافظ کا مقصود اگرچہ ایک ہی ہے مگر اقبال حسنِ طلب میں حافظ سے زیادہ عجز دکھاتے ہیں:

حسرتِ جلوۂ آن ماہِ تمامی دارم
دست بر سینہ، نظر برلبِ بامی دارم(۲۵)

خود حسین ہونا اور شکار کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہوئے شکار ہونے کی آرزو مندی اور پھر اس آرزومندی پر فخر و ناز ہونا یہ تغزل کی شان ہے۔یہاں نگارگری میں اقبال جزئیات نگاری پر آجاتے ہیں اور محبوب اور خصوصی طور پر زلفِ محبوب سے کہتے ہیں:

می گزرد خیالِ من ازمہ و مہر و مشتری

تو بہ کمین چہ خفتہ ای صید کن این غزالہ را(۲۶)

اسارتِ زلف کی آرزو مندی،تغزل کا بڑا پسندیدہ موضوع ہے۔ جسے اقبال نے بڑی فنی چابکدستی سے باندھا ہے:

من بندۂ بی قیدم شاید کہ گریزم پا
این طرۂ پیچان را در گردنم آویزی(۲۷)

اقبال محبوب کو بلکہ زلفِ محبوب کو مزید اکساتے ہیں اور یہی اکساہٹ تغزل کہلاتی ہے:

فرصتِ کشمکش مدہ این دلِ بی قرار را
یک دو شکن زیادہ کن گیسوئی تابدار را(۲۸)

مزید دیکھیے اقبال آئندہ بیت میں استفہام اقراری کا وہ رنگ اختیار کرتے ہیں کہ اکابرین کا لطفِ تغزل بھی ماند پڑ جاتا ہے:

دام ز گیسوان بہ دوش زحمتِ گلستان بری
صید چرا نمی کنی طائرِ بام خویش را(۲۹)

زلف کے اختیار و تاثیر کے بعد تغزل کے ضمن میں بزرگ شعراء نے جس وصف کا ذکر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ "ایمان ربائی چشم محبوب کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔" جسے نظیری نے یوں ادا کیا ہے:

ہزار شیخ و برہمن ز کیش و دین برگشت
تصرفِ نظر ارجمند راچہ خبر(۳۰)

نظیری کا شعر اطلاع ہے مگر اقبال کا شعر دعوت ہے اور دعوت ہی تغزل ہے۔اب دیکھیے اقبال اسی تقاضے کو کس خوبی سے نبھاتے ہیں:

کنشت و کعبہ و بت خانہ و کلیسا را
ہزار فتنہ ازان چشم نیم باز آور(۳۱)

جبکہ اقبال کا رنگِ تغزل خواجۂ شیراز کے اس شعر کے زیادہ قریب ہے:

دارد دلِ درویش تمنائی نگاہی
زان چشم سیہ مست بہ یک غمزہ رواکن(۳۲)

اور اقبال اسی برق نگاہی کے شدید آرزو مند ہیں:

کجاست برقِ نگاہی کہ خانمان سوزد
مَرا معاملہ باکشت و حاصل است ہنوز(۳۳)

ادب میں ایک صنعت کو تجاہل عارفانہ بھی کہتے جبکہ تغزل میں اس ادا کو تغافل عارفانہ بھی کہا جا سکتاہے طلب و تغافل کے تناسب کو بیدل (۱۱۳۳ھ) عظیم آبادی نے بڑے کمال سے یوں ادا کیا ہے:

بہ ہر کجا ناز سربر آرد نیازہم پائی کم ندارد
تو و خرامی و صد تغافل من و نگاہی و صد تمنا(۳۴)

بیدل کا شعر تناسب کی عمدہ مثال ہے مگر اقبال کا طرزِ ادا اسی خیال کو اپنے عجز سے تغزل بنا دیتا ہے:

من چشم نہ بردارم ازروئی نگارینش
آن مستِ تغافل را توفیقِ نگاہی نیست(۳۵)

پھر نظیری اسی خیال کو مزید ایک فروتنی زیبا عطا کرتے ہیں:

نیاز شیوۂ ماعاجزانِ محتاج است
ترا کہ حسن و جمال است بی نیازی بس(۳۶)

مگر اقبال محبوب کے تغافل کو تغزل کے رنگ میں ڈبو دیتے ہیں اور اقبال کے یہاں محبوب کے اُس تغافل کی شکر گزاریاں بیان ہوتی ہیں جو عشاق کے لیے جلوہ دزدی میں مددگار ثابت ہوتا ہے، اقبال نے اس رنگ کو کس سلاست اور چاہت سے بیان کیا ہے:

تغافلے کہ مَرا رخصت تماشا داد
تغافل است و بہ از التفاتِ دَمبدم است(۳۷)

محبوب کے تغافل سے جلوہ اندوزی کا یہ ڈھنگ اقبال کے یہاں ترقی کرتا ہوا محبوبِ مجازی کی لطافت کو اتنا مزکیٰ کر دیتا ہے کہ شاعر یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ یہ عقل کی نارسائی ہے نفیِ ظہور نہیں:

زشانِ حسنِ تو نہ توان نشان گفتن معاذاللہ
تو در دانش نمی گنجی و در بینش نمی آئی(۳۸)

لیکن اقبال کا صرف استفہامیہ انداز ہی اس خیال کو تغزل بنا دیتا ہے:

این کیست؟ بردل ہا آوردۂ شب خونی
صد شہر تمنا را یغما زدی ترکانہ(۳۹)

پھر نظیری بڑی تیزی سے سوال کرتے ہیں:

نی یار و محرم را گزر، نی صبر و راحت رامقر
آخر درین ویرانہ دل تنہا چسان جا کردۂ؟(۴۰)

مگر اقبال بڑی سادگی میں اس کا جواب دے کر اسی خیال کو تغزل بنا دیتے ہیں:

من بتلاشِ تو رَوم یا بتلاش' خود رَوم
عقل و دل و نظر ہمہ گم شدگانِ کویِ تو(۴۱)

اور پھر نظیری بھی اقبال کے ہمنوا بن جاتے ہیں:

رسوا منم وگرنہ توصد بار در دلم
رفتی و آمدی وکسی را خبر نہ شد(۴۲)

نظیری کی بے خبری عجز محض رہتی ہے جبکہ اقبال کا پیرایۂ آمدوشد کا بیان کچھ ایسا ہے کہ نظیری کی بات بھی رہ جاتی ہے اور اپنی بات ہو بھی جاتی ہے محبوب کے لیے اسلوب کا یہی رنگِ تغزل کہلاتا ہے:

در موجِ صبا پنہاں دزدیدہ بہ باغ آئی
در بوی گل آمیزی باغنچہ در آویزی(۴۳)

اقبال اس لطیف آمدوشد کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ محبت کی حدّت زمانی اور مکانی فاصلے مٹا دیتی ہے:

نہ تواندر حرم گنجی نہ در بت خانہ می آئی
ولیکن سوئی مشتاقان چہ مشتاقانہ می آئی(۴۴)

بلکہ اقبال تو کچھ اور آگے بڑھ جاتے ہیں اور یہ برملا اظہار، اگرچہ تغزل کے منافی ہے مگر اقبال کے لفظی تلازمے تغزل کی نفی نہیں ہونے دیتے:

ہنگامہ بَست از پیٔ دیدارِ خاکیئی
نظارہ را بہانہ تماشایِ رنگ و بوست(۴۵)

یہ سب جلوہ ریزیاں اپنے ساتھ بڑی حشر سامانیاں لاتی ہیں مگر عشاق تو مدتوں سے ایسی ایماں ستانیوں کے منتظر ہوتے ہیں:

بہ غارت می بری سرمایۂ تسبیح خوانان را
بہ شب خونِ دلِ زناریان ترکانہ می آئی(۴۶)

جب یہ مطالبے پورے ہو جاتے ہیں تو محب اور محبوب پر ایک نئی مشکل آن پڑتی ہے کہ زیارت کی حرارت کو کیسے ٹھنڈا کیا جائے لہٰذا تغزل کا ایک خاص انداز، یہ بھی ہے حسرت موہانی کے بقول:

سب غلط کہتے تھے لطفِ یار کو وجہِ سکوں
دردِ دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا(۴۷)

اسی بات کا گلہ اقبال یوں کرتے ہیں:

نگاہِ شوق تسلی بہ جلوۂ نہ شود
کجا بُرم خلشی را کہ در دل است ہنوز(۴۸)

لہٰذا اقبال نے اس کا ایک حل پیش کیا ہے کہ جلوہ کو ختم ہی نہ ہونے دیا جائے مگر کب تک؟

حضورِ یار حکایت دراز تر گردید
چنانکہ این ہمہ ناگفتہ در دل است ہنوز(۴۹)

اقبال کے نزدیک پیشِ محبوب "ہمہ تن چشم" بن جانا ہی بہتر ہے لیکن اس سے پہلے اپنے ایک خاص، واضح اور بیباک انداز میں کہتے ہیں:

زِمشتاقان اگر تابِ سخن بردی، نمیدانی

محبت می کند گویا نگاہِ بی زبانی را(۵۰)

مگر اقبال کے مندرجہ ذیل شعر میں "نرگس"، "جمال"، "کرشمہ" اور ضمیر متصل کی "ش" نے مندرجہ بالا سارے خیال کو تغزل کا رنگ دے دیا ہے:

در نرگس آرمید کہ بیند جمالِ ما
چندان کرشمہ دان کہ نگاہش بہ گفتگو ست(۵۱)

محبت کے معاملے میں بہت سی باتیں حسبِ معمول نہیں ہوتی مگر ہوتی ہیں جسے سچی محبت اپنے اثبات کے لیے لفظوں کی محتاج نہیں ہوتی۔ تغزل کے اس رنگ کو خان خانان (۹۶۶ھ) نے ادا کیا تھا:

بہ کیش صدق و صفا حرفِ عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبت تمام سوگند است(۵۲)

لیکن دیکھیے اقبال نے اسی رنگ کو کتنی وضاحت عطا کر دی ہے:

یک نگہ، یک خندۂ دزدیدہ، یک تابندہ اشک
بہرِ پیمانِ محبت نیست سوگندِ دگر(۵۳)

اور اقبال اپنے اسلوب کے ساتھ حوالہ بھی منسلک کرتے ہیں:

مرا در دل خلید این نکتہ از مردی ادادانی
زمعشوقان نگہ کاری تراز حرفِ دلآویزی(۵۴)

پھر اقبال کہتے ہیں کہ ایسے خسارے کرنے والے کیا واقعی خسارے میں رہتے ہیں؟

ہمہ سرمایۂ خود را بہ نگاہی بہ دہند
این چہ قومی است کہ سودا بہ زیان نیز کنند(۵۵)

نہیں بلکہ فتراک زہبی محبوب تو ایک سعادت عظمیٰ ہے اور جس کے شکار ہونے کا ذکر اقبال نے شروع میں کیا تھا اب وہ تقاضا پورا ہونے کو ہے یہ طرزِ خیال اور یہ طرزِ ادا ہی تغزل بن جاتے ہیں:

تپید یک دم و کردند زیبِ فتراکش
خوشا نصیب غزالی کہ زخمِ اوکاریست(۵۶)

اقبال کے بقول کیوں نہ پھر اس نگاہ کو سیلوٹ پیش کیا جائے:

از ما بہ گو سلامی آن ترکِ تند خورا
کہ آتش زد از نگاہی یک شہر آرزو را(۵۷)

اور کیوں نہ اُسے درازی عمر کی دعائیں دی جائیں کہ سچی محبت اور تغزل کو یہی زیبا ہے:

کو آن نگاہِ ناز کہ اول دلم ربود
عمرت دراز باد ہمان تیرم آرزوست(۵۸)

اقبال کے اس رنگ کے شعروں کی بنا پر ہی پروفیسر وقار عظیم یہ کہنے پر مجبور سے نظر آتے ہیں کہ:

''یہی وہ شعریت ہے۔ یہی وہ تغزل، جس نے ہر دور میں اقبال کے شعر کو تختِ ذہن پر متمکن کرنے کے بجائے خانۂ دل میں جگہ دی کہ تغزل کو یہی گوشۂ عافیت محبوب ہے۔''(۵۹)

اقبال نے ''پیام مشرق'' کے دیباچہ میں گوئٹے کے بارے میں بڑے بیباک سے انداز میں دوبار یہ کہا ہے کہ ''گوئیٹے تغزل محض کا دلدادہ ہے۔''(۶۰) لیکن تغزل کے معاملے گوئیٹے کے بارے یہ کہتے ہوئے اقبال اپنے سامنے سجے قدِ آدم آئینے کو شاید بھول گئے ہیں!

فارسی غزل اقبال کے پاس کنیا سے کامنی بن کر آئی۔ اقبال نے اپنے خونِ جگر کی سرخی، گرمی اور شوخی سے اس کی نگار گری کی۔ اقبال نے اپنے فن کے کامل رچاؤ سے اس کی حنابندی کی اور اس کی مانگ میں چنچلتا کا وہ من موہک سندور بھرا کہ اور اقبال کا یہی رنگِ تغزل پاک و ہند میں پروان چڑھنے والے فارسی ادب میں آج تک معیاری غزل بھی ہے اور معیارِ تغزل بھی کہ جسے تغزل مؤقر کی واحد مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شبلی نعمانی، علامہ، شعر العجم، ج۴، پاکستان، لاہور، شیخ فرحان علی اینڈ برادرز، ۱۹۶۶ء، ص۵

۲۔ مسعود رضوی، ادیب، ہماری شاعری، پاکستان، لاہور، اردو بازار، نذر سنز، ۱۹۸۷، ص۷، ۱۷

۳۔ شفیعی کدکنی، محمد رضا، موسیقی شعر، ایران، تہران، انتشارات آگاہ، ۱۳۶۸ھ، (بار دوم)، ص۳۹

۴۔ اقبال، محمد، علامہ، ڈاکٹر، پیامِ مشرق، پاکستان، لاہور، احسن برادر، ۱۹۴۸ء، ص۱۹۱

۵۔ ایضاً

۶۔ عبادت بریلوی،ڈاکٹر،غزل اور مطالعہ غزل،پاکستان،کراچی،انجمن ترقی اردو،۱۹۸۸،ص۱۸۔۱۷

۷۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر مباحث،پاکستان،لاہور،مجلس ترقی ادب،۱۹۶۵،ص۵۳۹۔۵۳۸

۸۔ وقار عظیم،پروفیسر،"اقبال کی نظموں میں تغزل کے رنگ" مشمولہ،مطالعہ اقبال،پاکستان،لاہور، ۱۹۸۳،ص۳۵۳

۹۔ جمال،انور،ادبی اصطلاحات،پاکستان،لاہور،نیشنل بک فاؤنڈیشن،۱۹۹۸ء،ص۳۹

۱۰۔ اقبال،پیام مشرق،ص۱۷۶

۱۱۔ اقبال،محمد،علامہ،ڈاکٹر،زبورِ عجم،پاکستان،لاہور،شیخ غلام علی اینڈ سنز،۱۹۷۰،(بار نہم)ص۱۴۸

۱۲۔ عابد علی عابد،سید،پروفیسر،مقالاتِ عابد،پاکستان،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۹ء،ص۲۲

۱۳۔ یوسف حسین خان،ڈاکٹر،روحِ اقبال،پاکستان،لاہور،چوک مینار انکارکلی آئینہ ادب،۱۹۶۳ء،(بار اول در پاکستان)ص۲۲

۱۴۔ وقار عظیم،پروفیسر،مطالعہ اقبال،ص۲۶۳

۱۵۔ یوسف حسین خان،ڈاکٹر،روحِ اقبال،ص۲۴

۱۶۔ سید عبداللہ،مطالعہ اقبال،ص۱۱۱۲۔۵۹

۱۷۔ فرحان فتح پوری،ڈاکٹر،اقبال سب کے لیے،پاکستان،کراچی،سندھ،اردو اکیڈمی،۱۹۷۸،ص۴۳۶

۱۸۔ نظیر،ولی الدین،محمد مشمولہ،اردو کی مختصر ترین تاریخ،ڈاکٹر سلیم اختر،پاکستان،لاہور،سنگِ میل پبلی کیشنز،۱۹۸۶،ص۹۰

۱۹۔ اقبال،پیام مشرق،ص۱۳۷

۲۰۔ نظیری نیشاپوری،محمد حسین،دیوانِ نظیری نیشاپوری،باہتمام محمد رضا طاہر حسرت،ایران،تہران،نگاہ، ۱۳۷۹ھ،ص۱۳۰

۲۱۔ اقبال،پیام مشرق،ص۱۷۷

۲۲۔ اقبال،ابور عجم،ص۷۸

۲۳۔ ایضاً،ص۱۴

۲۴۔ حافظ شیرازی، محمد، شمس الدین، خواجہ "دیوانِ حافظ" (باہتمام تیمور برہان بودہی) ایران، تہران، انتشارات سنائی، ۱۳۷۴ھ، ص ۲۴۲

۲۵۔ اقبال، پیام مشرق، ص ۱۹۰

۲۶۔ اقبال، زبورِ عجم، ص ۹

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱

۲۸۔ ایضاً، ص ۲۷

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۴

۳۰۔ نظیری نیشاپوری، دیوانِ نظیری نیشاپوری، ص ۱۵۲

۳۱۔ اقبال، زبور عجم، ص ۸

۳۲۔ حافظ، دیوانِ حافظ، ص ۲۴۴

۳۳۔ اقبال، زبورِ عجم، ص ۵۲

۳۴۔ بیدل، عبد القادر، مشمولہ، فارسی غزل کا ارتقاء، مرتبہ (ظہیر احمد صدیقی، پروفیسر) ۱۹۹۳ء، پاکستان، لاہور، جی سی یو، ص ۶۵

۳۵۔ اقبال، زبورِ عجم، ص ۱۵۰

۳۶۔ نظیری نیشاپوری، دیوانِ نظیری، ص ۱۸۲

۳۷۔ اقبال، زبورِ عجم، ص ۱۲۵

۳۸۔ نظیری نیشاپوری، دیوانِ نظیری، ص ۲۹۸

۳۹۔ اقبال، پیام مشرق، ص ۱۹۸

۴۰۔ نظیری نیشاپوری، دیوان نظیری، ص ۲۹۷

۴۱۔ اقبال، زبورِ عجم، ص ۳۷

۴۲۔ نظیری نیشاپوری، دیوان نظیری، ص ۵۰۱

۴۳۔ اقبال، زبورِ عجم، ص ۱۰

۴۴۔ اقبال، پیام مشرق، ص ۲۰۷

۴۵۔　اقبال، زبورِ عجم، ص۱۳۳

۴۶۔　اقبال، پیام مشرق، ص۲۰۷

۴۷۔　حسرت، موہانی، مولان، دیوانِ حسرت، مرتبہ: فرحت صباء، خیام پبلی کیشنز، پاکستان، لاہور، س۔ن، ص۲۷

۴۸۔　اقبال، زبورِ عجم، ص۵۲

۴۹۔　ایضاً

۵۰۔　ایضاً، ص۷۶

۵۱۔　ایضاً، ص۱۳۲

۵۲۔　عبدالرحیم، خانِ خاناں، مشمولہ، فارسی غزل کا ارتقاء، ص۱۳۴

۵۳۔　اقبال، زبور عجم، ص۱۷۰

۵۴۔　اقبال، پیام مشرق، ص۱۶

۵۵۔　اقبال، زبورِ عجم، ص۱۰۰

۵۶۔　ایضاً، ص۱۰۹

۵۷۔　اقبال، پیام مشرق، ص۱۸۱

۵۸۔　ایضاً، ص۱۸۶

۵۹۔　وقار عظیم، پروفیسر، مشمولہ: مطالعہ اقبال، ص۳۶۸

۶۰۔　اقبال، محمد، علامہ، دیباچہ پیام مشرق، پاکستان، لاہور، احسن برادرز، ۱۹۴۸، ص ح، ر